معارفِ اسمِ

اللہ

لفظِ اللہ کے تفسیری معارف

پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر القادری

نام کتاب	:	معارفِ اِسمِ اَللّٰہ
تصنیف	:	ڈاکٹر محمد طاہر القادری
پروف ریڈنگ	:	عبدالشکور طاہری
کمپوزنگ	:	بصیر احمد
زیرِ اِہتمام	:	فریدِ ملّت رحمۃ اللہ علیہ ریسرچ اِنسٹیٹیوٹ www.MinhajBooks.com
مطبع	:	منہاجُ القرآن پرنٹرز، لاہور
نگرانِ طباعت	:	شوکت علی قادری
اِشاعت	:	
اِشاعتِ سوم	:	فروری 2003ء (1,100)
قیمت	:	

❁❁❁

publications@minhaj.biz

معارفِ اِسمِ اَللّٰہ

ڈاکٹر محمد طاہر القادری

مِنہاجُ القرآن پبلیکیشنز
365- ایم، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 5168514، 3-5169111
یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور، فون: 7237695
www.Minhaj.org - www.Minhaj.biz

بسم الله الرحمن الرحيم

مَوْلَایَ صَلِّ وَ سَلِّمْ دَآئِمًا اَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ کُلِّهِمِ
مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْکَوْنَیْنِ وَ الثَّقَلَیْنِ
وَ الْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّ مِنْ عَجَمِ

﴿صَلَّی اللهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَ عَلٰی آلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ وَ بَارَكَ وَسَلَّمَ﴾

حکومتِ پنجاب کے نوٹیفکیشن نمبر ایس او (پی۔ا) ۴-۱/ ۸۰ پی آئی وی، مؤرّخہ ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء؛ حکومتِ بلوچستان کی چٹھی نمبر ۸۷-۴-۲۰ جنرل و ایم ۴/ ۹۷۰-۳-۷، مؤرّخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۸۷ء؛ حکومتِ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی چٹھی نمبر ۲۴۴۱۱-۶۷ این۔ا/ اے ڈی (لائبریری)، مؤرّخہ ۲۰ اگست ۱۹۸۶ء؛ اور حکومتِ آزاد ریاست جموں و کشمیر کی چٹھی نمبر س ت/ اِنتظامیہ ۶۳-۸۰۶۱/ ۹۲، مؤرّخہ ۲ جون ۱۹۹۲ء کے تحت ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف کردہ کتب تمام سکولز اور کالجز کی لائبریریوں کے لئے منظور شدہ ہیں۔

لفظِ اللہ کے تفسیری معارف

لفظِ اللہ کی اسمی اہمیت

تسمیہ میں استعمال ہونے والا دوسرا لفظ اللہ ہے، جو ذات باری تعالیٰ پر دلالت کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے اسمِ ذات کہتے ہیں اور اس کے علاوہ باقی سب ناموں کو اسمائے صفات۔ یہ لفظ باری تعالیٰ کی ان تمام صفاتِ حسن و کمال کو حاوی ہے جن سے وہ متصف ہے۔ کسی بھی ذات کا صحیح ادراک اس کی صفات کو جاننے ہی سے ممکن ہوتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تمام صفات و کمالات کو جانا جائے۔ محض چند صفات کے حوالے سے کسی شخصیت کی جزوی اور نامکمل معرفت تو حاصل ہوسکتی ہے اُس کا جامع تعارف ممکن نہیں۔ 'اسم ذات' شخصیت کی مِن حیثُ الکل نشاندہی کرتا ہے۔ اس کی دلالت محض شخصیت کے کسی خاص گوشے یا پہلو پر نہیں ہوتی۔ جب کہ اسمائے صفات میں سے ہر اسم، ذات کی کسی نہ کسی ایک صفت کو ہی اجاگر کرسکتا ہے۔ مثلاً 'قدیرٌ' اللہ تعالیٰ کی صفتِ قدرت پر دلالت کرتا ہے۔ **علیم** اس کی صفتِ علم پر، **حیّ** اس کی صفت حیات پر، **کلیم** اس کی صفتِ کلام پر، **سمیع و بصیر** اس کی صفتِ سمع و بصر پر، **خالق** اس کی صفت خلق پر، **رب** اس کی صفتِ ربوبیت پر اور **رحمان و رحیم** اس کی صفتِ رحمت پر۔ الغرض یہ سب اسماء ذات باری تعالیٰ کی مختلف صفات کی نشاندہی کررہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اسم ایسا نہیں جو جمیع صفاتِ الوہیت کا احاطہ کرسکے اور اس کو سنتے ہی اس حسنِ مطلق کا ایسا تصور ذہن میں آسکے، جو مِن کلِّ الوجوہ مکمل ہو۔ اللہ ہی ایک ایسا نام ہے جس کی دلالت کلی طور پر اس واجب الوجود پر ہے جو جامع صفات و کمالات ہے۔

یہ ذات حق کی کسی ایک یا چند صفات کی نہیں بلکہ بیک وقت ذات اور اس کی تمام صفات کی نشاندہی کرتا ہے۔ کیونکہ صفات ایک اعتبار سے گویا ذات کا حصہ ہوتی ہیں۔ جب کہ ذات اپنی کسی بھی صفت کا حصہ نہیں ہوتی۔ ذات کے دامن میں اس کی تمام صفات ازخود موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے اسمِ ذات ہی جملہ صفات و کمالات کو پورے طور پر محیط ہوتا ہے۔

قرآن اور بیانِ اسمِ ذات

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جہاں بھی باری تعالیٰ کے حسن صفات و کمال کا ذکر آیا ہے، اُس کا آغاز بالعموم اسمِ ذات سے ہی ہوا ہے۔ اس کے ساتھ باقی اسماءِ حسنیٰ کا بیان یوں معلوم ہوتا ہے جیسے اجمال کی تفصیل بتائی جا رہی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ○(۱)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہر نہاں و عیاں کا جاننے والا، وہی ہے بڑا مہربان رحمت والا○''

اس سے آگے پھر فرمایا:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَا اِلٰـهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ○(۲)

''وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں، بادشاہ، نہایت پاک، سلامتی دینے والا، امان بخشنے والا، حفاظت فرمانے والا، عزت والا، عظمت والا، تکبر والا، اللہ پاک ہے ان کے شرک سے○''

---

(۱) القرآن، الحشر، ۵۹: ۲۲

(۲) القرآن، الحشر، ۵۹: ۲۳

اس سے اگلی آیت کا بھی اندازِ بیان یہی ہے، ارشاد ہوتا ہے :

هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰیؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُO(۱)

’’وہی اللہ ہے بنانے والا، پیدا کرنے والا، ہر ایک کوصورت دینے والا، سب اچھے نام اسی کے ہیں۔ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسی کی تسبیح کرتے ہیں اورعزت وحکمت والا ہےo‘‘

اسی طرح آیۃ الکرسی میں بھی صفات و افعالِ خداوندی کے بیان کا آغاز اسمِ ذات سے ہی ہوا ہے۔ مزید برآں قرآنِ حکیم میں جا بجا ذاتِ باری تعالیٰ کا تعارف اسی مقدس نام کے ذریعے کرایا گیا ہے، چند مقامات ملاحظہ کیجئے:

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ۔(۲)

’’فرمائیے! کون رب ہے آسمانوں اور زمین کا،آپ ﷺ خود ہی فرما دیجئے! اللہ ہے۔‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِؕ قُلِ اللّٰهُ ۔(۳)

’’آپ فرمائیے: تمہیں آسمانوں اور زمین سے روزی کون دیتا ہے، آپ (خود ہی) فرما دیجئے! کہ اللہ (دیتا ہے)۔‘‘

ایک مقام پر کفار کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوَاتِ وَ الْاَرْضَ وَ سَخَّرَ الشَّمْسَ وَ

---

(۱) القرآن، الحشر، ۵۹: ۲۴

(۲) القرآن، الرعد،۱۳: ۱۶

(۳) القرآن، السباء،۳۴: ۲۴

الْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔(۱)

''اور اگر آپ ان سے پوچھیں کس نے بنائے آسمان اور زمین اور (کس نے) کام میں لگائے سورج اور چاند تو وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔''

اس سے آگے پھر فرمایا گیا:

وَ لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ مِنْ بَعْدِ مَوْتِهَا لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ۔(۲)

''اور اگر آپ ﷺ ان سے پوچھیں کس نے اتارا آسمان سے پانی؟ پھر اس کے سبب سے زمین کو مردہ ہو چکنے کے بعد زندہ کر دیا تو ضرور کہیں گے اللہ نے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

اَللّٰهُ يَبْدَؤُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ۝(۳)

''اللہ ہے جو پہلے بناتا ہے، پھر دوبارہ بنائے گا۔ پھر تم اسی کی طرف پھیر دیئے جاؤ گے۝''

اسی صورت میں مزید فرمایا گیا:

اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ ثُمَّ رَزَقَكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ(۴)

''اللہ ہے جس نے تمہیں پیدا کیا، پھر تمہیں روزی دی، پھر تمہیں مارے گا، پھر تمہیں زندہ کرے گا۔''

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا ہے:

---

(۱) القرآن، العنکبوت، ۲۹: ۶۱

(۲) القرآن، العنکبوت، ۲۹: ۶۳

(۳) القرآن، الروم، ۳۰: ۱۱

(۴) القرآن، الروم، ۳۰: ۴۰

اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ مَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ۔(۱)

’’اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، چھ دن میں بنائے پھر عرش پر استوا فرمایا۔‘‘

علٰی ہذا القیاس نہ صرف ہر جگہ باری تعالیٰ نے اپنی ذات کا تعارف لفظِ اَللّٰہ کے حوالے سے ہی کرایا ہے۔ بلکہ ہمیشہ اپنی صفات وکمالات کا ذکر بھی اسی نام سے شروع کیا ہے۔چنانچہ قرآن کا یہ اندازِ بیان نہ صرف اس کے اسمِ ذات ہونے پر بلکہ اس کی اہمیت، جامعیت اور ہمہ گیریت پر بھی دلالت کرتا ہے۔

یہ اسمِ ذات (اَللّٰہ) قرآنِ حکیم میں کم و بیش ستائیس سو ایک (۲۷۰۱) مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ اتنی کثرت سے کوئی دوسرا لفظ قرآن میں استعمال نہیں ہوا۔

مذاہبِ عالم اور تصوّرِ اسمِ ذات

تاریخِ عالَم کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مختلف مذاہب میں خواہ توحید کا عقیدہ غالب رہا یا شرک کا، ذاتِ باری تعالیٰ کی نسبت لوگوں کے اذہان میں کوئی نہ کوئی ایسا تصور ضرور موجود رہا ہے جسے وہ تمام کائنات کا خالق و مالک سمجھتے تھے۔

اس ذات کی نشاندہی وہ اپنی اپنی مخصوص اصطلاحات کے ذریعے کرتے رہے مثلاً ہندو دھرم میں ’پرمیشور‘ کا لفظ عام دیوی دیوتا کے لئے نہیں بلکہ ربِ کائنات کے لئے بولا جاتا ہے۔ ’برہم‘ بھی اسی ہستی کا نام ہے۔ اسی طرح ہندو یوگ میں روحانی منازل طے کرنے کے لئے ’اوم‘ کا وِرد بطور ذکرِ اسمِ ذات مروج ہے۔ بلکہ یجروید ہندو دھرم کی مقدس مذہبی کتاب کے آخر میں بھی ’اوم‘ کو ’برہم‘ کا ذاتی نام لکھا گیا ہے۔ لیکن رگ وید ۴۔۱۸۔۶ میں جو منتر مذکور ہے، اس میں ندیوں کے اللہ، اللہ شبد پکارنے کا ذکر آتا ہے۔ جس سے

(۱) القرآن، السجدہ، ۳۲: ۴

یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ قدیم ہندولٹریچر میں بھی ذات حق کے لئے لفظِ 'اللہ' بطور اسمِ ذات مستعمل تھا۔ مذہبِ زرتشت کی تعلیمات کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں بھی 'آہورا مزدا' کو خالقِ کائنات کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ المنعم، المکین، الکامل، القدس، الحکیم، الخبیر، الغنی، الطیب، القھار، الشافی، الخلاق، العلیم وغیرہا۔ یہ سب اس کے اسماء صفات ہیں اور اس کا اسمِ ذات 'ہرمز' ہے۔ علامہ محمود العقاد اپنی کتاب 'اللہ' میں جناب زرتشت کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ زرتشت نے پکارا:

"یا ھرمز الرحیم صانع العالم المشھود، یا ایھا القدس ..... ای شئی ھو اقوی القوی جمیعا فی الملك والملکوت، فقال ھرمز ..... انه ھو اسم الذی یتجلی فی أرواح العلیین فھو القوی فی عالم الملکوت"

ترجمہ: اے ھرمز! رحم کرنے والے، عالم وجود کے پیدا کرنے والے، اے پاک ذات کے مالک...... کونسی شے کائنات میں سب سے زیادہ قوی ہے۔ھرمز نے کہا وہ نام (ھرمز) جو مقام علیین میں روحوں کے اندر روشن ہے پس وہ تمام کائنات میں سب سے زیادہ قوی ہے۔

ایک اور مقام پر زرتشت کے حوالے سے منقول ہے:

إن ھرمز خلق الدنیا فی ستة ادوار۔

''بے شک ہرمز نے دنیا کو چھ ادوار میں پیدا کیا۔''

گویا باری تعالیٰ (یعنی آہورمزدا) کے لئے مذہبِ زرتشت میں 'ہرمز' کا لفظ اسم ذات کے طور پر منقول ہے۔مختلف سامی زبانوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہاں باری تعالیٰ کے اسم ذات کے طور پر جو نام عام طور پر معروف رہا ہے۔ اس کا مادہ (الف، لام اور ھ) پر مشتمل ہے۔ عبرانی، سریانی، آرامی، کلدانی، حمیری اور عربی وغیرہ سب زبانوں میں یہی مادہ مختلف شکلوں میں پایا جاتا رہا ہے۔ مثلاً کلدانی اور سریانی

میں 'الاھیا' عبرانی میں 'الوہ' اور عربی میں 'الہٰ' جو 'ال' کے اضافے سے 'اللہ' قرار پا گیا۔ الغرض ہر دور میں ہر طبقہ وملت کے افراد باری تعالیٰ کی ذات وصفات کے لئے کوئی نہ کوئی ایسا جامع لفظ ضرور استعمال کرتے رہے ہیں، جس کی دلالت ہمہ گیر ہو اور جس سے بلاشرکت غیرے صرف ایک ہی ہستی کا سراغ مل سکے۔

لفظ اللہ کی شانِ علمیت

سیبویہ، خلیل اور دیگر فقہاء و اصولیین میں سے امام شافعی، خطابی، امام الحرمین اور امام غزالی وغیرہم کے قول کے مطابق لفظ ''اللّٰہ'' اسمِ علم غیر مشتق ہے۔ یعنی یہ لفظ صرف ذاتِ باری تعالیٰ کے نام کے طور پر وضع کیا گیا ہے اور بلاشرکت غیرے اسی پر ہی دلالت کرتا ہے۔ نہ یہ خود کسی لفظ سے ماخوذ ہے اور نہ ہی کوئی لفظ اس سے۔ گویا یہ لفظ خود بھی لفظی و معنوی اعتبار سے توحیدِ محض کی دلیل ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ہوتا ہے:

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَ اصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ○ (۱)

''(وہ) آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان دو کے درمیان ہے (سب) کا رب ہے پس اس کی عبادت کیجئے اور اس کی عبادت میں ثابت قدم رہیئے ○''

اس آیتِ مبارکہ میں جس حقیقت کے بیان پر زیادہ زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ خالقِ کائنات اور معبودِ برحق کی شانِ توحید کا یہ عالم ہے کہ کسی کو اس کے ساتھ 'اسمی شرکت' بھی حاصل نہیں۔ اس کی وحدانیت اس قدر ظاہر ہے کہ مشرکین نے معبودانِ باطلہ کے لئے طرح طرح کے نام اور صفات وضع کیں۔ لیکن آج تک کسی نے بھی اپنے کسی جھوٹے معبود کا نام ''اللہ'' نہیں رکھا لہذا یہ نام بھی اپنے وجود میں شروع سے آخر تک بے مثل اور بے نظیر رہا ہے۔ تاریخِ عالم بھی اس حقیقت کی کھلی تائید کرتی ہے مولانا ابوالکلام آزادؒ اسی تصور کو یوں بیان کرتے ہیں:

---

(۱) القرآن، مریم، ۱۹: ۶۵

’’نوعِ انسانی کے دینی تصورات کا ایک قدیم عہد جو تاریخ کی روشنی میں آیا ہے، مظاہرِ فطرت کی پرستش کا عہد ہے۔ اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اصنام پرستی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں بہت سے الفاظ دیوتاؤں کے لئے پیدا ہو گئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔ لیکن چونکہ یہ بات انسان کی فطرت کے خلاف تھی کہ ایسی ہستی کے تصور سے خالی الذہن رہے جو سب سے اعلیٰ اور سب کو پیدا کرنے والی ہستی ہے۔ اس لئے دیوتاؤں کی پرستش کے ساتھ ایک سب سے بڑی اور سب پر حکمران ہستی کا تصور بھی کم وبیش موجود رہا اسی لئے جہاں بے شمار الفاظ دیوتاؤں اور ان کی معبودانہ صفتوں کے لئے پیدا ہو گئے وہاں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا بھی ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے اس اَن دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کی طرف اشارہ کیا جاتا تھا۔(۱)

قرآنِ حکیم نے بھی کفارومشرکینِ مکہ کے اعتقادات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسی بات کو واضح کیا ہے۔وہ کہتے تھے:

مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى۔(۲)

’’ہم تو انہیں (یعنی بتوں کو) صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے پاس (نزدیک) کر دیں۔‘‘

ہر چند کہ اپنے دیوتاؤں کی پرستش کے لئے ان کا یہ استدلال اسلام کے نزدیک قابلِ قبول نہ تھا لیکن اس سے اتنی بات ضرور عیاں ہو گئی کہ وہ بھی تمام معبودانِ باطلہ پر کسی ایک ہستی کو فائق وبرتر اور کامل و برگزیدہ تصور کرتے تھے۔ اسی کے قرب کو اپنا منتہائے مقصود بیان کرتے اور اسی ہستی کو اللہ کے نام سے پکارتے تھے۔ چنانچہ یہ اس لفظ کی اپنی موزونیت اور انفرادیت ہے کہ اس ہستی مطلقہ کے لئے یہ لفظ بغیر کسی کی شراکت کے استعمال ہوتا رہا ہے۔ جب ہم اس لفظ کی شانِ عَلَمیت پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا

(۱) ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، ۱:۶۸

(۲) القرآن، الزمر، ۳۹:۳

ہے کہ اس ذات والا صفات کے بیان کے لئے واقعی اس سے زیادہ موزوں لفظ اور کوئی نہ ہوسکتا تھا۔ لفظ اللہ کی تعریف امام خازنؒ نے یوں بیان کی ہے:

هو إسم علم خاص لله تعالى تفرّد به البارى سبحانه و تعالى ليس بمشتق و لا يشركه فيه أحد(۱)

’’یہ اسم علم ہے جو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہے اور باری تعالیٰ کی وحدانیت پر دلالت کرتا ہے نہ یہ کسی سے مشتق ہے اور نہ اس میں کوئی اور شریک ہے۔‘‘

لفظِ اللہ کی ترکیب اور اُس کی معنوی حکمت

اس لفظ کا باری تعالیٰ کے اسم ذات کی حیثیت سے مستعمل ہونا کئی حکمتوں کی بنا پر ہے۔ ان میں سے ایک اس کی ترکیب لفظی میں پنہاں ہے۔ اگر اس لفظ سے کوئی حرف حذف بھی کردیا جائے تب بھی بقیہ حروف ذاتِ باری تعالیٰ کی نشاندہی کے لئے اپنا معنی برقرار رکھتے ہیں ۔ مثلاً اللہ کا پہلا حرف (الف) حذف کرلیں تو ’للہ‘ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے’اللہ کے لئے‘ اگر دوسرا حرف (لام) حذف کرلیں اور پہلا (الف) بحال رکھیں تو ’الہٗ‘ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے’معبودٗ اگر پہلے دونوں حروف (الف اور لام) حذف کرلیں تو ’لہٗ‘ باقی رہ جائے گا جس کا معنی ہے’اس کے لئے‘ اور اگر پہلے تینوں حروف حذف کر لئے جائیں تو ’ہ‘ باقی رہ جائے گا جو پھر بھی اسی کی ذات کی ہی نشاندہی کرتا ہے’ہ‘ (وہ) کے معنی میں بطور ضمیر استعمال ہوتا ہے اور صوفیاء بالعموم اس کا ذکر کرواتے ہیں گویا ’’اللہ‘‘ ایک ایسا لفظ ہے جو من حیث الکل بھی اور اپنے ہر حرف اور جزو کے اعتبار سے بھی ذات حق پر معنوی دلالت کرتا ہے۔ اس نام کی ترکیب لفظی کے حسن کا یہ عالم ہے کہ اس کا کوئی حرف یا کوئی حصہ بھی بے معنی نظر نہیں آتا۔ گویا یہ لفظ بھی ذات باری تعالیٰ کی طرح ہر ہر اعتبار سے کامل ہے۔ کسی اسم کی اپنے مسمّٰی پر اس سے زیادہ دلالت کا اور کیا تصور ہوسکتا ہے۔

---

(۱) خازن، لباب التأویل فی معانی التنزیل، ۱: ۱۳

لفظِ اللہ کی اصل اور اُس کا اِشتقاق

بعض علماء کے نزدیک لفظِ اللہ ’اسمِ علَم غیر مشتق‘ ہے جبکہ بعض علماء و محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ ’اسمِ مشتق‘ ہے۔ اس لحاظ سے اس کے متعدد مادے (Origins) بیان کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک مشتق منہ معنوی طور پر ذات باری تعالیٰ کی مختلف شانوں اور حیثیتوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ عام طور پر اہل علم یہ تصور کرتے ہیں کہ اس لفظ کی اصل ’’اِلٰہ‘‘ ہے جس کا معنی ’’معبود‘‘ ہے۔ جو ’’ال‘‘ کے اضافے سے معرف ہو کر ’’اللہ‘‘ قرار پا گیا۔ ’’لام تعریف‘‘ کے بارے میں عربی زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ اگر کسی اسم کو معرف باللام کر دیا جائے (یعنی اس کے آغاز میں ’’ال‘‘ کا اضافہ کر دیا جائے) تو وہ اسم اپنے استعمال اور اطلاق میں خاص ہو جاتا ہے۔ مثلاً کتاب کا لفظ عام ہے، کسی بھی کتاب پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اگر اسے الکتاب کر دیا جائے تو اس کا اطلاق صرف کسی مخصوص کتاب پر ہوگا، ہر ایک پر نہیں۔ اسی طرح اِلٰہ کو معرف کر کے اللہ بنانے میں یہی مصلحت تھی کہ الوہیت صرف ذات حق سے مختص تصور کی جائے اور پوری کائنات میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی اور ہستی اِلٰہ کہلانے کی مستحق نہ رہے۔ یہی مفہوم کلمہ توحید کے پہلے حصے کے ذریعے ادا ہوتا ہے۔ اگر باری تعالیٰ کو صرف اِلٰہ کہہ کر ہی پکارا جاتا تو اس سے اس کی شانِ الوہیت اور شانِ معبودیت تو آشکار ہوتی لیکن معبودانِ باطلہ کی نفی نہ ہوسکتی۔ گویا صرف ’’اثبات‘‘ ہوتا، نفی کا بیان نہ ہوتا۔ اس طرح یہ اسم جامع ضرور تصور کیا جاتا لیکن مانع نہ ہوتا اور اسم باری تعالیٰ کی انفرادیت و موزونیت کے لئے ضروری تھا کہ وہ جامع بھی ہو اور مانع بھی۔

چنانچہ اس حکیم و خبیر نے اپنی ذات کی دلالت کے لئے ایسے لفظ کو منتخب فرمایا جو

بیک وقت اس کے لئے الوہیت کا اثبات اور اس کے ماسویٰ کے لئے الوہیت کی نفی کر رہا ہے، یہاں نفی و اثبات کا اجتماع اس پہلو کو بھی اجاگر کر دیتا ہے کہ اسلام صرف حق کے اثبات کا ہی نہیں بلکہ ہر باطل کی نفی کا بھی نام ہے اور یہی تصور در اصل اسلام کے انقلابی فلسفے کی بنیاد ہے۔ لفظ اللہ کی اصل کے بارے میں امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں۔

أصله إِله فحذفت همزته و ادخل عليها الالف واللام فخص بالبارى تعالٰى۔(۱)

(۱) اصفہانی، المفردات: ۸۲

''اس کی اصل الٰہ ہے جس کے ہمزہ (ء) کو حذف کر دیا گیا اور اس پر (ال) داخل کر کے اسے ذات باری کے لئے خاص کر دیا گیا ہے۔''

پہلا مادۂ اشتقاق: أَلَهَ (عبادت کرنا)

اس لفظ کے کئی مادے بیان کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس کے لغوی اشتقاق کے سلسلہ میں علماء کا ایک قول یہ ہے کہ یہ 'أَلَهَ' یَأْلَهُ سے مشتق ہے۔ اس کا معنی عبادت کرنا ہے۔ اس طرح الٰہ کا معنی معبود (جس کی عبادت کی جائے) قرار پایا۔ زمانہ قدیم میں سورج کی پرستش کرنے والوں نے سورج کا نام الٰہہ رکھا ہوا تھا۔ اس کی وجہ تسمیہ بھی یہی تھی کہ وہ اسے معبود تصور کرتے تھے۔ امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں کہ لفظ الٰہ معبود سے عبارت نہیں بلکہ اس کی دلالت اس وجود یا ہستی پر ہوتی ہے جو خود معبود ہونے کی اہل اور مستحق ہو۔ قرآن حکیم میں لفظ الٰہ اکثر و بیشتر معبود کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَاتَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِيْ ط قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْمَاعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ○(۱)

(۱) القرآن، البقرہ، ۲: ۱۳۳

’’جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا: تم میرے (انتقال کے) بعد کس کی عبادت کرو گے؟ تو انہوں نے کہا! ہم آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام اور اسحٰق علیہ السلام کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود و یکتا ہے، اور ہم (سب) اسی کے فرماں بردار رہیں گے○‘‘

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

قَالَ یَا قَوْمِ اعْبُدُوْا اللّٰهَ مَا لَکُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ط اَ فَلَا تَتَّقُوْنَ○(۱)

’’انہوں نے کہا اے میری قوم! تم اللہ کی عبادت کیا کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم پرہیزگار نہیں بنتے○‘‘

اسی مضمون کی متعدد آیات قرآن حکیم میں موجود ہیں۔ جن سے الٰہ کا معنی ’’معبود‘‘ متحقق ہوتا ہے۔ اسی طرح ارشاد ربانی ہے:

وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِکَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدُوْنِ○(۲)

’’اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر ہم اس کی طرف یہی وحی کرتے رہے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں پس تم میری (ہی) عبادت کیا کرو○‘‘

اس مادۂ اشتقاق کی بنا پر لفظ اللہ کا معنی یہ ہوا کہ وہ اکیلی ذات جو مستحقِ عبادت ہے۔ جو اپنے وجود و کمال میں اس قدر جامع اکمل اور اتم ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرے کے لئے پرستش کے لائق ہے۔ جو خود واجب ہے اور باقی سب ممکن، جو خود خالق ہے اور باقی سب مخلوق، جو خود مالک ہے اور باقی سب مملوک، جو خود باقی ہے اور باقی سب فانی، جو خود قدیم ہے اور باقی سب حادث، جو خود غنی ہے اور باقی سب محتاج، جو خود ہی ازلی

(۱) القرآن، الاعراف، ۷:۶۵

(۲) القرآن، الانبیاء، ۲۱:۲۵

وابدی ہے، اول وآخر ہے اور ظاہر وباطن ہے اور جو کچھ اس کائنات کے نقطہ آغاز سے لے کر نقطہ انجام تک وجود میں آ رہا ہے، اسی کے فیضان ربوبیت کا پرتو ہے۔ چونکہ کائنات کی ہر چیز اپنے ہونے، باقی رہنے اور کمال پانے میں اس کی محتاج ہے۔ اس لئے اس کے سوا کوئی بھی پرستش کے لائق نہیں۔ کیونکہ جو محتاج ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سورہ اخلاص میں تمام صفاتِ الوہیت کے بیان کو اس طرح جمع کیا گیا کہ وہ سورت لفظ اللہ کی مکمل تعریف بن گئی، ملاحظہ ہو۔

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ○ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ○ وَ لَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا اَحَدٌ○(۱)

’’آپ فرما دیں وہ اللہ ہے (جو) ایک ہے○ اللہ بے نیاز ہے○ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا○ اور نہ اس کا کوئی جوڑ ہے○‘‘

دُوسرا مادۂ اشتقاق: اَلِهَ (تحیر و درماندگی)

لفظ اَللّٰہ کے اشتقاق میں دوسرا قول یہ ہے کہ یہ اَلِہَ سے ماخوذ ہے۔ اس کا معنی تحیرودرماندگی ہے۔ رب ذوالجلال کے لئے اس لفظ کا اسم قرار پا جانا اس کی عظمت اور علو مرتبت کی صحیح نشاندہی ہے۔ کیونکہ انسان ذاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیراور فہم و اِدراک کی درماندگی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کی ہستی میں غور کرے گا۔ اس کی حیرت واستعجاب میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ اس پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ معرفت الٰہی کی ابتدا بھی عجز وحیرت تھی اور انتہا بھی عجز وحیرت ہے۔

اے بروں از وهم و قال و قیلِ من
خاك بر فرقِ من و تمثیلِ من

(۱) القرآن، الاخلاص، ۱۱۲

حواسِ انسانی ذاتِ حق کا ادراک نہیں کر سکتے۔ عقلِ انسانی اس کے فہم سے قاصر ہے۔ کشف و وجدان اس کی کامل معرفت سے عاجز ہیں۔ انسان جب اپنی تمام ظاہری و باطنی صلاحیتوں اور نفسی استعدادوں کو بروئے کار لا کر بھی اس حسنِ مطلق کے جلووں کا صحیح نظارہ نہیں کر سکتا اور اس حقیقتِ ابدی کو اپنے دامنِ عقل و فہم میں سمو نہیں سکتا تو اس کی زبان بے ساختہ پکار اٹھتی ہے۔

مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ ۔(۱)

''اے حسنِ ازل! ہم تجھے اس طرح نہیں جان سکے جیسے تجھے جاننے کا حق تھا۔''

اس لئے کہ وہ کُل ہے اور باقی سب جزو۔ وہ خود محیط ہے اور باقی سب محاط۔ وہ غیر محدود ہے اور باقی سب محدود۔ اس کی حقیقت سب جاننے والوں کی سرحدِ ادراک سے ماوراء ہے اور اس کی ہستی سب دیکھنے والوں کی منتہائے نظر سے بلند و بالا ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ○ (۲)

''نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے○''

اسی وجہ سے حکم دیا گیا:

تَفَكَّرُوْا فِيْ اٰلَآءِ اللّٰهِ وَلَا تَتَفَكَّرُوْا فِي اللّٰهِ ۔(۳)

---

(۱) ۱۔ مناوی، فیض القدیر، ۲:۴۱۰

۲۔ کشف الظنون، ۱:۸۹۲

(۲) القرآن، الانعام، ۶:۱۰۳

(۳) ۱۔ طبرانی، المعجم الاوسط، ۶:۲۵۰، رقم: ۶۳۱۹

۲۔ بیہقی، شعب الایمان، ۱:۱۳۶، رقم: ۱۲۰

''اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں غور وفکر کرو اور ذات باری تعالیٰ میں غور وفکر نہ کرو۔''

قرآنِ حکیم میں جا بجا آیاتُ اللہ (خدا کی نشانیوں) میں غور وفکر اور تعقل و تدبر کی تعلیم دی گئی ہے۔ ذات ایزدی میں تفکر کے لئے نہیں کہا گیا، ارشاد ہوتا ہے:

مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ اِنَّ فِيْ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ○(۱)

''اللہ نے یہ (سب کچھ) نہیں پیدا فرمایا مگر درست تدبیر کے ساتھ، وہ (ان کائناتی حقیقتوں کے ذریعے اپنی خالقیت، وحدانیت اور قدرت کی) نشانیاں ان لوگوں کے لئے تفصیل سے واضح فرماتا ہے جو علم رکھتے ہیں○ بیشک رات اور دن کے بدلتے رہنے میں اور ان (جملہ) چیزوں میں جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا فرمائی ہیں (اسی طرح) ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو تقویٰ رکھتے ہیں○''

دوسرے مقام پر اسی طرح ارشاد فرمایا:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْ اَنْفُسِهِمْ۔(۲)

''ہم انھیں جلد ہی کائنات میں اور ان کے نفوس میں اپنی نشانیاں دکھا دیں گے۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

أَ وَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ۔(۳)

۳۔ ہیثمی، مجمع الزوائد، ۱:۸۱

۴۔ سیوطی، الدر المنثور، ۲:۱۱۰

(۱) القرآن، یونس، ۱۰:۵، ۶

(۲) القرآن، حم سجدہ، ۴۱: ۵۳

(۳) القرآن، الروم، ۳۰:۸

''کیا وہ اپنے نفوس میں تفکر نہیں کرتے۔''

تفکر فی آیات اللہ کی تلقین دیگر مقامات پر اس طرح کی گئی ہے۔

كَذَالِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ○(۱)

''اسی طرح اللہ تمہارے لئے (اپنے) احکام کھول کر بیان فرماتا ہے تا کہ تم غور وفکر کرو○''

مزید ارشاد ہوتا ہے:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ط رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ○(۲)

''یہ وہ لوگ ہیں جو (سراپا نیاز بن کر) کھڑے اور (سراپا ادب بن کر) بیٹھے اور (ہجر میں تڑپتے ہوئے) اپنی کروٹوں پر (بھی) اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق (میں کارفرما اس کی عظمت اور حسن کے جلووں) میں فکر کرتے رہتے ہیں (پھر اس کی معرفت سے لذت آشنا ہو کر پکار اٹھتے ہیں) اے ہمارے رب! تو نے یہ (سب کچھ) بے حکمت اور بے تدبیر نہیں بنایا تو (سب کوتاہیوں اور مجبوریوں سے) پاک ہے ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے○''

متذکرہ بالا آیات اس امر پر دلالت کرتی ہیں کہ عالم کون ومکان میں کارفرما قدرت کی نشانیوں میں غور وفکر سے ہستی باری تعالیٰ کا پتہ چلتا ہے اور اس کی معرفت کی راہ نصیب ہوتی ہے۔ جوں جوں اِنسان انفس و آفاق کی آیات و علامات کے فکر میں منہمک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس پر ذات حق کی عظمتیں اور سطوتیں مزید آشکار ہوتی چلی جاتی ہیں

(۱) القرآن، البقرہ، ۲:۲۱۹

(۲) القرآن، آل عمران، ۳:۱۹۱

اور وہ تحیر و اِستعجاب کے سمندر میں غرق ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر عالم حیرت میں گم ہو جاتا ہے۔ صوفیاء کے نزدیک معرفت کی منزلوں میں اس 'مقامِ حیرت' کو نہایت بلند درجہ حاصل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ کئی عرفاء طوِیل طوِیل مدت تک آیاتِ الٰہیہ میں غور و فکر کرتے ہوئے مقامِ حیرت میں اس طرح گم کھڑے رہے کہ اس محویت میں نہ انھیں اپنی خبر رہی نہ دنیا کی۔ حتی کہ یہی حیرت منتہائے معرفت قرار پا گئی۔ لیکن اس درجہ تک عقل کو نہیں بلکہ صرف عشق و محبت ہی کو رسائی حاصل ہوتی ہے۔ بقول اقبالؒ:

بو علی اندر غبارِ ناقہ گم
دستِ رومی پردۂ محمل گرفت

اسی لیے علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور
چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

دنیا کے تمام عرفاء اور حکماء اس امر پر متفق رہے ہیں کہ آگہی کی انتہا بے خبری ہے اور علم کا آخری نقطۂ کمال لاعلمی ہے۔ جب چشمِ علم و معرفت پر تمام حجابات کے اٹھ جانے سے حقیقتِ ابدی منکشف ہو جاتی ہے اور عارف ذاتِ حق کی معرفت کے لیے قدم آگے بڑھاتا ہے تو اسے اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ اسے کچھ بھی معلوم نہیں اور اس لاعلمی کا علم ہی اس کے لئے سب سے بڑا علم قرار پا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ:

معلوم شُد کہ ہیچ معلوم نہ شُد

بس بارگہ الوہیت میں یہی انسانی علم کی انتہاء ہے کہ انسان کو اس کے ہونے اور اپنے نہ ہونے کی خبر ہو جائے۔ کسی نے اس مقام معرفت کو کیا خوب بیان کیا ہے کہ:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

اکبر نے حیرت ودرماندگی اور تحیر و بے خبری کو منتہائے علم تصور کرتے ہوئے کیا خوب کہا تھا کہ:

ہر ایک بات پہ کہتا تھا من نمی دانم
یہ بات سچ ہے کہ اکبر بہت ہی عالم تھا

بابا بلھے شاہؒ فرماتے ہیں:

علموں بس کریں او یار

اس لئے اس ذاتِ بلند وبرتر نے اپنا نام اللہ ﷻ منتخب فرمایا تاکہ انسان پر یہ حقیقت واشگاف ہو جائے کہ وہ اس ہستیٔ مطلق کی عظمتوں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ اسی کو امام رازیؒ یوں بیان کرتے ہیں:

فَهٰهُنَا الْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الْإِدْرَاكِ اِدْرَاكٌ ۔(۱)

''پس اس مقام پر حصول ادراک میں عجز ونا کامی کا نام ہی ادرک ہے۔''

تیسرا مادۂ اِشتقاق: اَلَہَ (سکون پانا)

اس بارے میں تیسرا قول یہ ہے کہ 'اللہ ﷻ' 'أَلَہَ' سے مشتق ہے۔ جس کا معنی سکون پانا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ **ألهتُ إلى فلان أى سكنتُ إليه** کہ میں نے فلاں سے سکون پایا) ذات باری تعالیٰ کو ''اللہ ﷻ'' اس لیے کہا جاتا ہے کہ بیتاب دلوں کو اسی سے تسکین ملتی ہے، قرآن حکیم میں مذکور ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ○(۲)

(۱) رازی، التفسیر الکبیر، ۱:۱۶۰

(۲) القرآن، الرعد، ۱۳:۲۸

''جان لو کہ اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے○''

ایک اور مقام پر ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَ إِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتُهٗ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ○(۱)

''ایمان والے (تو) صرف وہی لوگ ہیں کہ جب (ان کے سامنے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے (تو) ان کے دل (اس کی عظمت و جلال کے تصور سے) خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور جب ان پر اس کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ (کلام محبوب کی لذت انگیز اور حلاوت آفریں باتیں) ان کے ایمان میں زیادتی کر دیتی ہیں اور وہ (ہر حال میں) اپنے رب پر توکل (قائم) رکھتے ہیں (اور کسی غیر کی طرف نہیں تکتے)○''

اس آیت میں اہل ایمان کی حالتِ محبت بیان کی جارہی ہے کہ اہل ایمان وہ ہیں جو اپنا رشتہ محبت اس محبوب حقیقی سے استوار کر لیتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ علامتِ محبت ہے کہ محبوب کا نام اور ذکر سن کر اہل محبت کے دلوں کو تسکین ملتی ہے، سب غمِ زیست بھول جاتے ہیں، دل اس کی یاد میں لذت وطمانیت اور کیف وسرور کی دولت پاتے ہیں۔ لیکن سورہ انفال کی آیت میں ''وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ'' کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ جن میں دل کے لرز جانے کا ذکر ہے۔ اہل دل سے یہ حقیقت بھی مخفی نہیں ہو گی کہ جب محبت شدت اختیار کر کے عشق کا روپ دھار لے تو دل پر عجیب کیفیات طاری ہونے لگتی ہیں ۔ اس وارفتگی اور جنون کی حالت میں جب محبوب کا نام سننے میں آئے۔ کہیں اس کا تذکرہ ہو یا خود دل میں اس کی یاد زور پکڑ لے تو دل لرز لرز جاتا ہے۔ بعض اوقات کپکپی کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے جسم میں سے بجلی کی لہر دوڑ گئی ہو۔ عاشق اس کی یاد میں ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگتا ہے، آنکھیں برسنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہی یاد اسے بے چین کر دیتی ہے اور یہی اس کے لیے باعث سکون بھی بنتی ہے۔ معروف شاعر متنبّی محبوب

(۱) القرآن، الانفال، ۸:۲

کا ذکر سننے پر دل کی کیفیت یوں بیان کرتا ہے:

أَليسَ وَعدتَّنی يَا قلبُ عنِّی
إِذا مَا تُبْتُ عن ليلٰی تتوبُ
فها أَنا تائبٌ عن حبِّ ليلٰی
فمَا لكَ كُلَّمَا ذُكِرَتْ تذُوبُ؟

(اے دل! کیا تُو نے مجھ سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا کہ جب میں لیلٰی کی محبت سے تائب ہو جاؤں گا تو تُو بھی توبہ کر لے گا۔ پس دیکھ میں تو لیلٰی کی محبت سے تائب ہو چکا ہوں۔ اب تجھے کیا ہوا ہے کہ جب بھی لیلٰی یاد آتی ہے (یا اس کا ذکر ہوتا ہے) تو تُو پگھلنا شروع کر دیتا ہے)

قرآن اہلِ ایمان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جب باری تعالیٰ کا ذکر ہوتا ہے تو اہل ایمان کے دل پگھلنے لگتے ہیں۔ کیونکہ جوں جوں حبِّ الٰہی عشق میں بدلتی جاتی ہے، ایمان کمال کو پہنچتا ہے، جیسے کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔(۱)

''اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں۔''

اسی ٹوٹ کر محبت کرنے کو ہی تو عشق کہتے ہیں اور اس کے کمال کا تقاضا یہ ہے کہ عاشق کو محبوب کے سوا نہ کسی اور کی طلب رہے اور نہ ضرورت۔ اسی بے نیازی کو قرآن ''وَعَلٰی رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ'' کے الفاظ سے تعبیر کر رہا ہے کہ اہل ایمان اپنے محبوب حقیقی کے علاوہ کسی اور کے لطف و کرم اور عنایت و احسان کی آرزو ہی نہیں کرتے۔ جب دنیا کی تمام متاع اور خیر کا منتہائے کمال سکونِ قلب ہی ہو اور یہ دولت انھیں دامنِ محبوب سے میسر

---

(۱) القرآن، البقرة، ۲:۱۶۵

آ جائے تو پھر انہیں کسی اور جانب نگاہ اٹھانے کی حاجت ہی کیوں ہو۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

سب کچھ خدا سے مانگ لیا تجھ کو مانگ کر
اُٹھتے نہیں ہیں ہاتھ میرے اِس دعا کے بعد

چنانچہ لفظ اَللّٰہُ ذات باری سے انسان کے محبت کرنے اور اسی سے سکون قلب پانے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لفظ پر الف لام کے واقع ہونے سے جو تعریف اور اختصاص پیدا ہورہا ہے۔ اس کی افادیت یہ ہے کہ انسان پر یہ حقیقت بھی منکشف ہوجائے کہ اس عالم آب وگل میں سوائے ذات باری تعالیٰ کے اور کوئی ہستی ایسی نہیں جو اسے حقیقی سکون کی دولت سے بہرہ ور کر سکے۔ گویا یہ نام پریشان حال لوگوں اور بے چین و مضطرب دلوں کو مژدۂ جانفزا سنا رہا ہے کہ دنیا کی گوناگوں مصیبتوں اور پریشانیوں سے نجات اور دل و دماغ کی آسودگی وطمانیت دنیوی عیش و آرام کے سامانوں سے میسر نہیں آ سکتی۔ زیادہ سے زیادہ دولت اور مادی وسائل و ذرائع سمیٹنے سے نصیب نہیں ہوسکتی، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی ہوس نفس پرستی کے تحت محکوم اور غلام بنا لینے سے نہیں مل سکتی، بلکہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے دامنِ لطف و عافیت سے وابستہ ہوکر نصیب ہوسکتی ہے۔ بیشک بیقرار دلوں کو اسی کی یاد میں قرار ملتا ہے اور غم حیات کے ستائے ہوئے انسانوں کو اسی سے لَو لگانے میں سکون ملتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ دنیا میں کتنے انسان ایسے ہیں، جو تمام مالی آسائشوں اور رنگین سامانیوں کے باوجود سکونِ قلب سے محروم ہیں اور اسی دولت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ اسی بنا پر وہ آئے دن متعدد امراض کا شکار بھی ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس، وہ خوش نصیب جنھوں نے تمام مادی دولتوں کے عوض ایک روحانی دولت یادِ الٰہی کی صورت میں پالی ہے، کس قدر مطمئن اور پرسکون رہتے ہیں۔ **لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ** کے مصداق ہر پریشانی سے محفوظ ہیں۔ یادِ حق سے شغف و انہماک کتنی لذت، سکون، طمانیت اور کیف و سرور عطا کرتا ہے۔ اس کا اندازہ تو اسی کو ہوسکتا ہے، جس نے شب کی تاریکیوں میں محبوبِ حقیقی کی خاطر اپنا پہلو بستر سے جدا رکھا ہو، جس نے

نصف شب اور آخر شب عشقِ اِلٰہی میں بسمل کی طرح تڑپنے کا مزہ چکھا ہو، جس نے راتوں کی خلوت کو محبوب کی یاد اور اس کے ذکر وفکر سے جلوت میں بدل کے دیکھا ہو، جس نے اسے منانے کے لئے رو رو کر اپنا دامن آنسوؤں سے بھگویا ہو اور جس نے عشق کی آگ کو سرد آہوں سے بجھانا سیکھا ہو، اسی کو اس سکون اور لذت کی خبر بھی ہوسکتی ہے اور قدر بھی، جس پر کیفیات کبھی بیتی ہی نہ ہوں، اسے ایسے احوال کی کیا خبر۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کوئی شخص نہایت خوش ذائقہ پھل کھا کر اس کی وہ لذت اور شیرینی جو اسے کھانے میں محسوس ہوئی تھی ایسے شخص کو سمجھانے لگے جس نے کبھی وہ پھل چکھا تک نہ ہو۔ آخر یہ کیونکر ممکن ہو گا۔ وہ شخص یقیناً اس لذت کو سمجھنے سے قاصر رہے گا جب تک کہ وہ خود اس پھل کو نہ کھا لے۔ لہذا اس سکون کو جو اللہ کی ذات سے لو لگانے میں میسر آتا ہے خود لو لگا کر محسوس تو کیا جاسکتا ہے دلائل سے سمجھا نہیں جاسکتا۔ اسی سکون قلب کے حصول کے لئے تو اہلِ دل شب بھر یادِ حق میں مشغول رہتے ہیں۔ جن کا ذکر قرآن کریم یوں کرتا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّ قِيَامًا۝(۱)

''اور (یہ) وہ لوگ ہیں جو اپنے رب کے لئے سجدہ ریزی اور قیامِ (نیاز) میں راتیں بسر کرتے ہیں٥''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ۝(۲)

''اور وہ پچھلی رات (اٹھ اٹھ کر) استغفار کرتے ہیں٥''

اس آیت میں اہلِ محبت کی دائمی حالت بیان کی جارہی ہے کہ محبوب کو منانے کے لئے ہمیشہ پچھلی رات آہ و بکا کرتے ہیں۔ اس سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہیں۔ اس کی یاد میں راتوں کی نیند اور سحر کا خمار انگیز وقت قربان کرتے ہیں۔ تب جا کر انھیں

---

(۱) القرآن، الفرقان، ۲۵: ۶۴

(۲) القرآن، الذاریات، ۵۱: ۱۸

''من کی دولت'' نصیب ہوتی ہے، اقبالؒ نے بجا کہا ہے:

عطار ہو، رومی ہو، رازی ہو، غزالی ہو
کچھ ہاتھ نہیں آتا، بے آہِ سحر گاہی

یہ سکونِ قلب یا من کی دولت ایسی دولت ہے جس پر نہ غربت اثر انداز ہوتی ہے نہ امارت، نہ سفر، نہ حضر، نہ بیماری، نہ صحت، نہ کمزوری، نہ طاقت، اس سے باطن میں ایک الگ دنیا آباد ہوتی ہے۔ جس کی رونقوں میں انسان مگن رہتا ہے اور تمام دنیوی احوال اس کے لئے اضافی ہوتے ہیں اور اضافی کیفیات عاشق کی دنیا میں اپنا کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ اقبالؒ نے دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے کیا خوب لکھا ہے۔

تری دُنیا جہانِ مرغ و ماہی
مِری دُنیا فُغانِ صبح گاہی
تری دُنیا میں میں محکوم و مجبور
مِری دُنیا میں تیری پادشاہی

چوتھا مادۂ اشتقاق: الوله (عقل کا گم ہونا)

دُوسرے اور چوتھے مادوں میں معنوی یکسانیت ہے۔ دوسرا مادہ اشتقاق الٰہ تھا۔ جس کا معنی تحیر ودرماندگی بیان کیا گیا ہے اور ولہ میں بھی یہی مفہوم پایا جاتا ہے۔ ان دونوں مادوں کے اعتبار سے لفظ الله اور اَللّٰہُ کا معنی یہ قرار پایا کہ وہ ذات جس کی جستجو میں عقل وخرد گم ہو جائیں۔

عقل ہمیشہ سے اسی حقیقتِ ابدی کی تلاش میں سرگرداں ہے لیکن آج تک بالیقین اسے پا نہ سکی۔ فلسفہ کا آغاز بھی اسی حقیقت یعنی منظور کو جاننے کی کوشش سے ہوا تھا۔ چنانچہ فلسفہ اپنے دورِ عقلیت میں حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکا۔ عقلیت سے مراد فلاسفہ

یونان کا یہ نقطہ نظر تھا کہ صرف عقل ہی ذریعۂ علمِ حقیقت ہے۔ اس سے محسوسات کے حقیقت ہونے کا انکار لازم آیا اور حقیقت کو صرف معقولات سے مختص کر دیا گیا۔ لیکن جو ذات عقل کے حیطۂ ادراک سے ماورا تھی، حقیقت قرار نہ پا سکی اور بالآخر فلاسفہ اس تصور علم سے تائب ہو گئے۔ اس کے بعد فلسفے کے دورِ حقیقت کا آغاز ہوا۔ جس میں صرف حواس کو ہی ذریعۂ علم حقیقت مانا گیا۔ اس طرح محسوسات حقیقت قرار پا گئے اور معقولات کے حقیقت ہونے کا انکار ہو گیا۔ لیکن جو وجود حواس کے حیطۂ اِدراک سے ماورا تھا، حقیقت قرار نہ پا سکا۔ عقل حقیقت کی تلاش میں سرگرداں وپریشان پھرتی رہی، بالآخر 'تشکیک' اور 'سوفسطائیت' کی نذر ہو گئی۔ فلاسفہ اور عقلاء کے پاس عقل کو اس بھنور سے نکالنے کی کوئی تدبیر نہ تھی اور نہ حقیقت کو پانے کا کوئی حتمی لائحہ عمل تھا، چنانچہ انھوں نے اپنی تلاش وجستجو کا رخ ہی پھیر لیا۔ انھوں نے توجہ منظور (جسے دیکھا جا رہا ہو) کی بجائے ناظر (خود دیکھنے والا) کی طرف کر لی۔ اور عقل کی بجائے 'اسے' تلاش کرنے کے 'اپنی' ہی تلاش میں مگن کر لیا۔ فلاسفہ کے اندازِ فکر اور سمت وجستجو میں یہ تبدیلی دراصل اس حقیقت کا اعلان تھا کہ ''عقل حقیقتِ ابدی کو نہیں پا سکتی''۔ عقل کے سفر میں اتنے مراحل اس لیے آئے کہ وہ اقدام وخطا (Trial and Error) کے طریق پر گامزن تھی۔ اگر وہ شروع سے آستانۂ مذہب پر سرِ تسلیم خم کر لیتی تو اسے اتنے جتن نہ کرنے پڑتے۔ کیونکہ مذہب تو اس حقیقت کو اللہ کا نام دے کر پہلے دن سے یہ پکار رہا تھا کہ اس ذات کا ادراک حواس وعقل کی پرواز سے بلند ہے۔ اگر عقل اس کی تلاش میں نکلے گی تو خود گم ہو جائے گی۔ لہٰذا اب عقل کا خود ناظر کی تلاش میں مصروف ہو جانا دراصل ''معرفتِ نفس'' کی سعی ہے اور یہ سعی ''ذریعۂ وجدان'' کے بغیر ممکن نہیں۔ تلاش کے لئے دو تو عالم تھے: عالم آفاق اور عالم انفس جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے:

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ۔(۱)

''ہم تمھیں اپنی نشانیاں انفس وآفاق کے دونوں عالموں میں دکھا دیں گے۔''

---

(۱) القرآن، حم سجدہ، ۴۱: ۵۳

عالم آفاق میں حواس اور عقل کی کاوشیں کارگر ہوسکتی تھیں وہ اپنی جدوجہد کر چکیں ۔ انہیں حقیقت کا سراغ بھی ملا لیکن اسے پا نہ سکیں، مگر عالم انفس میں معرفتِ نفس کی کاوش میں حواس اور عقل سے کہیں زیادہ وجدان کی ضرورت ہے۔ اس نہج پر بھی حقیقت کا احاطہ تو ممکن نہیں لیکن اس کی کچھ نہ کچھ معرفت ضرور حاصل ہوتی ہے ۔ جیسا کہ ''**من عرف نفسه فقد عرف ربه**'' (الحاوی للفتاوی للسیوطی،۲:۴۱۲) کے ارشاد سے ظاہر ہے۔ اقبالؒ تلاشِ حقیقت کے لیے صحیح سمت کی نشاندہی اس طرح کرتا ہے ۔

کرا جوئی چرا در پیچ و تابی
کہ اُو پیدا ست تو زیر نقابی
تلاش او کنی جز خود نہ بینی
تلاش خود کنی جز اُو نیابی

چنانچہ لفظ اللّٰہ جس واجب الوجود کی ذات والا صفات پر دلالت کرتا ہے۔ اس کی براہ راست معرفت عقلِ انسانی کے بس میں نہیں بلکہ یہ اس کے مظاہر سے ممکن ہے اور حقیقتِ انسانی خود اس ہستی مطلق کی سب سے کامل مظہر ہے۔ اس لئے اقبالؒ ایک اور مقام پر لکھتا ہے:

اگر خواھی خدا را فاش بینی
خودی را فاش تر دیدن بیاموز
اگر زیری ز خود گیری زبر شو
خدا خواھی بخود نزدیک تر شو

اقبال نے اِسی تصور کو ایک اور انداز میں یوں واضح کیا ہے:

چیست دیں؟ در یافتن اسرار خویش
زندگی مرگ است بے دیدار خویش

بر مقامِ خود رسیدن زندگی ست
ذات را بے پردہ دیدن زندگی ست

معرفت ذات حق کی راہ پانا عقل سے نہیں ذوق و جدان سے ممکن ہے۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

عقل تو خود ہی اس راہ میں دم بخود ہے اور اس حقیقت کی تلاش میں عقل مادی کا سہارا لینے والے بھی گم گشتہ را ہیں۔ عقل کی بے سروسامانی اور عشق کی شناسائیِ منزل راہ نوردوں کو پکار پکار کر کہہ رہی ہے:

بیا که عشق مسلمان و عقل زناری

پانچواں مادۂ اشتقاق: لاہ (بلندی و ارتفاع)

امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ الٰہ اور اللہ کا مشتق منہ 'لاہ' ہے۔ جس کا معنی ''بلند ہونا'' ہے۔ چنانچہ اس لفظ کی معنوی دلالت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو ہر عجز اور کمزوری سے بلند ہو، جو ہر نقص اور حرمان سے بلند ہو۔ جو ہر عیب و خطا سے بلند ہو۔ جو ہر ضرورت واحتیاج سے بلند ہو۔ جو ہر مناسبت ومماثلت سے بلند ہو۔ جو ہر ایک کے کفر وشرک سے بلند ہو۔ جو انسانوں کے ظلم ومعصیت سے بلند ہو۔ جو انسانی وہم وگمان سے بلند ہو۔ جو ممکنات ومحدثات سے بلند ہو۔ جو ہر مخلوق کی قوتِ ادراک سے بلند ہو۔ اور جو ہر ایک کی طاقتِ توصیف سے بھی بلند ہو، اسی لئے ارشاد فرمایا گیا:

سُبْحَانَهٗ وَ تَعَالٰی عَمَّا يَصِفُوْنَo (۱)

''وہ ان تمام باتوں سے پاک اور بلند و بالا ہے جو یہ (اس سے متعلق) کرتے پھرتے ہیںo''

---

(۱) القرآن، الانعام، ۶: ۱۰۰

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا گیا:

سُبۡحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ ○(۱)

''تیرا رب جو عزت والا رب ہے ان کی باتوں سے پاک اور بلند ہے○''

امام رازیؒ باری تعالیٰ کی مطلق بلندی و برتری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

لِأَنَّ الواجب لذاته ليس الا هو، والكامل لذاته ليس الا هو، والاحد الحق فى هويته ليس الا هو، والموجد لكل ماسواه ليس الا هو۔(۲)

ارتفاع عام طور پر ایک اضافی امر تصور کیا جاتا ہے، جس کا تعلق مکان سے ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات مکان اور اضافت مکانی سے بھی بلند و بالا ہے۔ اس لئے اس عالم کو جہاں اس کے انوارِ ذات کا جلوہ عیاں ہے۔ اصطلاح میں عالم لامکان کہتے ہیں۔ لامکاں کو عالَم کہنا بھی مجاز ہے ورنہ اس کی ذات اس سے بھی بلند ہے کیونکہ اس کا ارشاد تو یہ ہے:

أنا مكون المكان و ليس لى مكان سوى الانسان۔(۳)

''میں مکان کو پیدا کرنے والا ہوں اور سوائے انسان کے میرا کوئی مکان نہیں ہے۔''

اس کی تائید اس حدیث قدسی سے بھی ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا:

ما وسعنى سمائى ولا أرضى و لكن وسعنى قلب عبدى المؤمن۔(۴)

---

(۱) القرآن، الصافات، ۳۷:۱۸۰

(۲) القرآن، التفسیر الکبیر،۱:۱۶۰

(۳) غوث اعظمؒ الرسالۃ

(۴) ۱۔عجلونی، کشف الخفاء،۲:۲۵۵، رقم: ۲۲۵۶

۲۔ دیلمی، الفردوس،۳:۴۱۷، رقم: ۴۴۶۶

''مجھے آسمان اور زمین کی وسعتیں اپنے اندر نہیں سموسکتیں لیکن میں اپنے بندہ مومن کے دل میں سما جاتا ہوں۔''

اس لئے وہ ذات مکان اور سمت و جہت کے تعینات کے بغیر ہر شے سے بلند ہے۔ لیکن اس کی بلندی کائنات کی تمام جہتوں میں اس کے ظہور کو بھی مانع نہیں ہے۔ بناء بریں ارشادِ قرآنی ہے:

فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ(۱)

''پس تم جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے (یعنی ہر سمت ہی اللہ کی ذات جلوہ گر ہے)۔''

چھٹا مادۂ اشتقاق: لَاهَ يَلُوْهُ (مخفی ہونا)

اس اعتبار سے الٰہ اور اللہ کا اطلاق اس ذات اقدس پر ہوتا ہے جو ہر آنکھ سے پنہاں ہے، قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے:

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ○(۲)

''وہی اول ہے وہی آخر، وہی عیاں ہے وہی نہاں اور وہ ہر چیز کا جاننے والا ہے○''

گویا وہی ذات عیاں بھی ہے اور نہاں بھی۔ ظہور و احتجاب (اجاگر ہونا اور مخفی ہونا) دونوں شانوں کا بیک وقت ایک ہی ذات میں موجود ہونا اس طرح ممکن ہے کہ

i- صفات سے عیاں، ذات سے نہاں

وہ جلوۂ حسن اپنی صفات کے اعتبار سے عیاں ہو مگر ذات کے اعتبار سے نہاں،

---

(۱) القرآن، البقرہ، ۲: ۱۱۵

(۲) القرآن، الحدید، ۵۷: ۳

گویا کائنات میں ہرسُو اس کی صفات وکمالاتِ ربوبیت کا جلوہ ظہور پذیر ہو۔ اس کی بے پایاں رحمتیں اور نشانیاں اظہر من الشمّس ہوں جو قدم قدم پر انسان کو اس کے ہونے کا یقین دلا رہی ہوں۔ لیکن جب انسان اس کی ذات کا بے حجاب دیدار کرنا چاہے تو وہ مستور و محجوب رہے۔ یعنی اس کی صفات ظاہر ہوں اور ذات باطن جیسا کہ ارشاد ربانی ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَ هُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۔(۱)

’’نگاہیں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور وہ سب نگاہوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔‘‘

ii- شدتِ ظہور کے باعث آنکھوں سے نہاں

ظہور و بطون کی دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ذات اس قدر ظاہر ہو کہ دکھائی نہ دے سکے گویا وہ شدتِ ظہور کی بناء پر آنکھوں سے مخفی رہے۔ اس ضمن میں امام رازی فرماتے ہیں:

قال بعض المحققين: سبحان من احتجب عن العقول بشدة ظهوره واختفى عنها بكمال نوره۔(۲)

’’بعض محققین کہتے ہیں پاک ہے وہ ذات جو اپنی شدتِ ظہور کے باعث عقلوں سے محجوب ہے اور کمالِ نور کے باعث ان سے مخفی ہے۔‘‘

جیسے سخت گرمی کے موسم میں عین نصف النہار کے وقت سورج کو اس کی شدتِ ظہور کے سبب سے براہ راست دیکھا نہیں جا سکتا۔ اس طرح وہ عیاں ہو کر بھی نہاں رہتا ہے لیکن آفتاب کو اس نورحق کے ظہور تام سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ جس کا بیان **اَللّٰهُ نُورُ السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ** کے لفظوں میں کیا گیا ہو اور **وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا** کا اعلان جسکی جلوہ تابانیوں پر دلالت کرتا ہو۔ چنانچہ وہ ذات اپنے نورِ ذاتی اور نورِ صفاتی

(۱) القرآن، الانعام، ۶: ۱۰۳

(۲) رازی، التفسیر الکبیر، ۱: ۱۶۰

کے ساتھ اس قدر ظاہر، عیاں اور تاباں ہے کہ کوئی آنکھ اس کے جلوے کی تاب نہیں رکھتی۔ اس لئے وہ ظاہر ہو کر بھی مخفی رہتی ہے۔

iii- اِنتہائے قرب کے باعث نظروں سے نہاں

ذاتِ باری کے مخفی ہونے کا ایک مفہوم یہ ہے کہ وہ اس قدر قریب ہے کہ قابلِ ادراک نہیں۔ کسی چیز کو دیکھنے کے لئے ضروری ہے کہ درمیان میں مناسب فاصلہ ہو۔ اگر ناظر و منظور دونوں میں اتنا قرب ہو کہ نقطہ بھر بھی فاصلہ اور دوری باقی نہ رہے تو منظور مخفی ہی رہتا ہے اسے دیکھا نہیں جاسکتا۔ جیسے پتلی آنکھ کے اندر ہو کر بھی آنکھ سے مخفی ہے۔ اسی طرح ذاتِ حق انسان کے باطن میں سما کر بھی اس سے مخفی رہتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِىْ عَنِّىْ فَاِنِّىْ قَرِيْبٌ ۔(۱)

''اور (اے حبیب!) جب میرے بندے آپ سے میری نسبت سوال کریں تو (بتا دیا کریں کہ) میں نزدیک ہوں۔''

ایک اور مقام پر اس قرب کی نوعیت بھی بیان کی گئی ہے۔

وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ○ (۲)

''اور ہم اس سے دل کی رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں○''

اس آیت میں بھی قرب کو مبالغے کے صیغے سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن قرب کی حد متعین نہیں کی گئی جس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ وہ ذات اپنے بندے سے اتنی قریب ہے کہ اس کا اندازہ بھی ممکن نہیں۔ گویا ذاتِ حق سارے جہان اور اہلِ جہان کی جان ہے اس لئے بدن اسے دیکھنے سے قاصر ہیں، بقول شخصے:

---

(۱) القرآن، البقرہ، ۲:۱۸۶

(۲) القرآن، ق، ۵۰:۱۶

حق جانِ جہان است و جہاں جملہ بدن
توحید ہمیں است دِگر حیلہ و فن

حضرت رومیؒ جان وتن کے قرب کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

سرِ من از نالۂ من دُور نیست
لیک چشم و گوش را آں نور نیست
تن ز جان و جاں زتن مستور نیست
لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں:

محرمِ ایں ہوش جُز بے ہوش نیست
مرزباں را مشتری چوں گوش نیست

حقیقت یہی ہے کہ قربِ الٰہی کا یہ ہوش پوری دنیا و مافیہا سے بے ہوش ہوئے بغیر نصیب نہیں ہوسکتا۔

چوں ایں جا بے خودی می آورد ہوش
عبارت را اشارت گفت خاموش

iv- خود مخفی مگر اپنے تصرفِ قدرت کو ظاہر کرنے والی ذات

ذاتِ حق کے ظاہر اور باطن ہونے کا معنی یہ بھی ہے کہ وہ ذات خود مخفی ہے، لیکن ہر شے میں اپنی قدرت کو ظاہر کرنے والی ہے۔ اس کی مثال روح کی سی ہے، جو خود مخفی رہتی ہے مگر اپنے تصرفات کو جسم کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ جسم درحقیقت مردہ و بے جان ہوتا ہے لیکن روح کا محکوم۔ لوگوں کی نظر میں جسم کی حرکات عیاں ہوتی ہیں اور وہ روح جو اصل محرک ہے، نہاں ہوتی ہے۔ گویا روح کی حیثیت ''ہست نیست نما'' کی ہوتی

ہے کہ خود حقیقت میں متصرف ہے لہذا ’’ہست‘‘ ہے اور حرکتِ جسم جو اصلاً نیست تھی روح کی وجہ سے ہست نظر آنے لگی۔ اسی طرح گردباد میں ہوا اصل محرک ہوتی ہے لیکن خاکی ذرات تیز رفتاری کے ساتھ گول چکر میں متحرک دکھائی دیتے ہیں۔ ہوا مخفی اور محجوب رہتی ہے اور ذرات ظاہر و عیاں۔ لوگوں کی نگاہیں ذرات کی حرکت پر پڑتی ہیں لیکن ہر ہر ذرے کے پیچھے کارفرما قوت نظر نہیں آتی۔ درحقیقت ہست تو وہ صاف ہوا تھی جس نے تحریک کے ذریعے ذراتِ خاک کی حرکت کو نیست سے ہست بنادیا۔ اس طرح وہ قادرِ مطلق جو قیومِ عالم ہے وہی ہست ہے لیکن نیست نما ہے جس نے اپنے تصرف سے موجوداتِ عالم کو متحرک بنادیا ہے وہ خود تو مخفی ہے لیکن اس کا تصرف کائنات کے ذرے ذرے میں ظاہر و باہر ہے۔ ورنہ اس کے بغیر ہر چیز نیست و معدوم تھی۔ اس قرآنی ارشاد کا یہی معنی ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَه‘۔(۱)

’’سوائے اس کے ہر ہست، نیست ہے۔‘‘

چونکہ ہر شے اسی کی ہستی سے قائم ہے اس لئے ارشاد فرمایا گیا:

وَ هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ۔(۲)

’’تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔‘‘

لہٰذا اللہ کا لفظ ان معنوں میں اس ذات کے مخفی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

ساتواں مادۂ اشتقاق: الٰه (جھکنا، راغب ہونا اور رجوع کرنا)

اس اعتبار سے اله کا معنی ہوا جس کی طرف جھکا جائے اور رجوع کیا جائے۔ اور اللہ کا معنی لام تعریف کے باعث یہ طے پایا کہ وہی ایک ذات ہے جس کی طرف

---

(۱) القرآن، القصص، ۲۸:۸۸

(۲) القرآن، الحدید، ۵۷:۴

جھکنا، راغب ہونا اور رجوع کرنا فطری اور لابدی امر ہے گویا ''اَللّٰہُ'' کے کلمات اس حقیقت کا کھلا اعلان کر رہے ہیں کہ اے انسان تو چاہے جتنا سرکش وباغی بن جا۔ اپنے رب کی اطاعت وغلامی سے جتنا بھی منہ موڑ لے۔ سرکش وباغی شخص بھی بالآخر اسی کی طرف جھکتا ہے، اس کی ذات سے دل کا علاقہ جس قدر چاہے، منقطع کرلے، لیکن جب بھی تجھ پر آفت ومصیبت کی گھڑی آئے گی ساری دنیا کے اسباب وذرائع سے تو کلیتًا مایوس ہو جائے گا اور کسی چیز پر بھی تیری کوئی اُمید باقی نہ رہے گی تو اس وقت تیرا دل عاجزی اور شکستگی کے ساتھ بے اختیار ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف جھک جائے گا، تو اسے والہانہ رغبت اور رجوع کے ساتھ پکار اٹھے گا کہ اے اللہ مجھے بچالے اور میرے حال پر رحم فرما، تیرے لاشعور کی یہ دبی ہوئی آواز بلند ہو جائے گی۔ جب سب امیدیں ٹوٹ جائیں اورصرف ایک ہی امید باقی رہ جائے تو وہ امید ''اللہ تعالیٰ'' کی ذات رحیم وکریم کی ہوتی ہے اس وقت ہر انسان خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم۔ موحد ہو یا مشرک، مومن ہو یا کافر ملحد بلا استثناء اسی ذات کو پکارتا ہے اور دل اس کے سوا کسی اور جانب جھکنے کو تیار نہیں ہوتا۔ یہ طبعی وفطری حقیقت ہر صورت میں رونما ہو کر رہتی ہے ۔خواہ بندہ اسے کوئی بھی نام دے دے۔ اس ہستی کو خدا کہے یا کوئی اور ماورائی طاقت لیکن اس کا دل کسی عظیم ہستی کے تصور سے پسیجتا ضرور ہے۔ بس یہی ذات وحدہ لاشریک ہے اور اسی کا نام ''اَللّٰہُ'' ہے۔

لفظِ اَللّٰہُ اور لفظِ انسان کا معنی

مزید برآں جب 'اَللّٰہُ' کے لفظ میں اس کی طرف راغب ہونے کا معنی موجود ہے تو اس کے بالمقابل انسان ہی سب سے زیادہ مستحق ہستی ہے جو اس کی طرف سب سے بڑھ کر راغب اور مانوس ہو۔ کیونکہ لفظ 'انسان' بھی اسی حقیقت کو بیان کرتا ہے۔ 'انسان' کے بارے میں دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ 'اُنس' سے ماخوذ ہے اور دوسرے یہ کہ 'نسیان' سے۔ پہلے مادے کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا، 'مانوس ہونے والا' جب کہ دوسرے مادے کے اعتبار سے اس کا معنی ہوا 'بھولنے والا'۔ ان دونوں معنوں میں کوئی

تضاد ہرگز نہیں۔ اس لئے کہ اُنس سبب ہے اور نسیان اس کا نتیجہ۔ جب انسان کسی سے مانوس ہوتا ہے اور محبت کرنے لگتا ہے تو رفتہ رفتہ وہ محبوب کے ما سوا کو بھولتا جاتا ہے، جب اُنس ومحبت کمال کو پہنچتے ہیں تو وہ محبوب کے علاوہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اسے اپنی بھی ہوش اور خبر باقی نہیں رہتی۔

ذاکر همه ذکر و ذکر مذکور شود

گویا یہی نسیان اس کے اُنس کے کامل ہونے کی دلیل بن جاتا ہے۔ اب ایک طرف اللہ جلوہ حسن کے طور پر موجود ہے اور دوسری طرف 'اِنسان' اس کی جانب راغب اور مانوس ہونے کے لئے۔ چنانچہ وہ ذات جس کی طرف محبت کرنے والے دل جھکتے اور راغب ہوتے ہیں ذات باری ہے۔ اور جو افراد اس حسنِ ازل کی محبت میں گرفتار ہیں 'کامل اِنسان' ہیں یہی پیغامِ محبت لفظ اللہ کے ذریعے بنی نوعِ انسان کو دیا جارہا ہے کہ اے افرادِ نوعِ انسانی !زوال پذیر حسن کے جلووں سے دل لگانے کی بجائے اس لازوال حسن کے گرویدہ ہو جاؤ۔ اسی کی طرف لپکو اور اسی کو اپنا منتہائے مقصود سمجھو کیونکہ اس کی محبت میں جو موت آئے گی وہ حیاتِ ابدی کا پیش خیمہ ہوگی۔

آٹھواں مادۂ اشتقاق : الہ (پناہ دینا)

اس مادے کے اعتبار سے لفظ ''اللہ'' اس معنی پر دلالت کرتا ہے کہ وہی وہ ذات ہے جو ہر ایک کو پناہ دینے والی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَ هُوَ يُجِيْرُ وَ لَا يُجَارُ عَلَيْهِ۔(۱)

''اور جو پناہ دیتا ہے اور جس کے خلاف (کوئی) پناہ نہیں دی جا سکتی۔''

پناہ دینا مصیبت زدہ افراد کے لئے سب سے بڑی نعمت اور عطا ہے۔ انسان اپنی زندگی میں جتنی بھی نعمتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ اللہ تعالیٰ ہی

---

(۱) القرآن، المومنون، ۲۳:۸۸

کی عطا کردہ ہیں، وہ فی الحقیقت انسان کا اپنا کسب نہیں ہیں۔ آنکھوں کی بصارت ہو یا کانوں کی سماعت، زبان کا ذائقہ ہو یا ہاتھ پاؤں کی حرکت۔ دماغ کی فکری قوت ہو یا طبعی ونفسانی لذات۔ الغرض حیاتِ دنیوی کی تمام نعمتیں اگر اللہ تعالیٰ عطا نہ کرے تو پیدائش سے لے کر تا دمِ مرگ انسان کسی وقت بھی ان کے حصول پر قادر نہیں ہوسکتا۔ جب خود زندگی بھی اللہ تعالیٰ ہی کی دَین ہے تو اس کے لوازمات وانعامات اس کی عطا کیوں نہ ہوں، قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَ مَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ(۱)

''اور تمہیں جو نعمت بھی حاصل ہے سو وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔''

ارشاد الٰہی ہے:

وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ۔(۲)

''اور وہ (سب کو) کھلاتا ہے اور (خود اسے) کھلایا نہیں جاتا۔''

ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔(۳)

''آپ فرما دیں (حقیقتاً) سب کچھ اللہ کی طرف سے (ہوتا) ہے۔''

چنانچہ لفظ 'اللّٰہ' کی معنوی افادیت یہ ہوئی کہ وہ ذات جو سب کچھ عطا کرے لیکن خود کچھ نہ لے۔ اسی لئے وہ خود کو الصمد (بے نیاز) کہتا ہے۔ یہاں یہ گمان نہیں ہونا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں سے عبادت کا طلب گار ہے۔ نہیں نہیں۔ عبادت اس کی نہ ضرورت ہے اور نہ اجرت، بلکہ عبادت در اصل خشوع وخضوع، تذلل انکساری اور عاجزی کی انتہائی صورت کا نام ہے۔ اس لئے اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انسان کو سائل بننے کا

---

(۱) القرآن، النحل، ۱۶:۵۳

(۲) الانعام، ۶:۱۴

(۳) القرآن، النساء، ۴:۷۸

سلیقہ سکھاتا ہے، تاکہ اس کی بارگاہِ صمدیت سے کچھ مانگنے کا ڈھنگ آ جائے اور وہ ذات اپنے بندے کی عاجزی دیکھ کر اسے مزید لطف وکرم سے نوازے۔ اللہ تعالیٰ کا علی الاطلاق مجیر ومعطی ہونا اس حدیث صحیح سے کتنا واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ۔(۱)

''بے شک تقسیم میں ہی کرتا ہوں لیکن عطا اللہ تعالیٰ کرتے ہیں۔''

گویا انبیاء کرام بھی روئے زمین پر باری تعالیٰ ہی کی نعمتوں اور عطاؤں کو تقسیم کرنے کے لئے تشریف لاتے رہے۔ متذکرہ بالا تمام معانی کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ ذات باری تعالیٰ کی کامل دلالت کے لئے اللہ سے بہتر کوئی اور نام نہیں ہوسکتا تھا۔ اس لئے تسمیہ میں اسی نام سے آغاز کیا گیا۔

---

(۱) ا۔ بخاری، الصحیح، ۱:۳۹، کتاب العلم، رقم:۷۱
۲۔ بخاری، الصحیح، ۳:۱۱۳۴، أبواب الخمس، رقم: ۲۹۴۸
۳۔ بخاری، الصحیح، ۶:۲۶۶۷، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، رقم: ۶۸۸۲